بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آج کل مشرقی پاکستان میں زبان کا مسئلہ جس طریقے سے اٹھ کھڑا ہوا ہے، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں بھڑک اٹھا ہے، وہ درحقیقت بڑا ہی خطرناک ہے۔ اور اس سے کچھ کم خطرناک وہ ردعمل بھی نہیں ہے جو اس سے مغربی پاکستان میں رونما ہو رہا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں اس وقت کوئی ایسی قیادت و رہنمائی موجود نہیں ہے جو باشندگانِ ملک کی معتمد علیہ بھی ہو اور تدبر کے ساتھ معاملات کو سلجھا بھی سکے۔ اسی فقدان کی وجہ سے پاکستان کے دونوں حصے، جو حالات کی ستم ظریفی سے پہلے ہی ایک دوسرے سے ہزار میل دور ہیں، اب تیزی کے ساتھ اپنے رجحانات میں دور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے درمیان باہمی شبہات کے حجابات بڑھ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ کچھ نادان اور کچھ خود غرض لوگ اب دونوں طرف یہ احساس بھی ابھار رہے ہیں کہ ان کے مفاد ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ یہ ایک ایسی خطرناک صورتِ حال ہے جس کا اگر ابھی تدارک نہ کیا گیا تو یہ خدانخواستہ دونوں کی علیحدگی اور بالآخر دونوں کی موت پر منتج ہو سکتی ہے۔ لہٰذا آج ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے تمام بہی خواہوں کو، خواہ وہ مشرق میں رہتے ہوں یا مغرب میں، چند اہم حقیقتوں کی طرف توجہ دلائیں جنہیں نظر انداز کر دینے کی وجہ سے، یا جن کی اہمیت محسوس نہ کرنے کی وجہ سے یہ خرابی رونما ہو رہی ہے۔

سب کو معلوم ہے کہ سابق ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی عظیم الشان قوم، پچھلے سیاسی واقعات کی وجہ سے دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ اس کے چار کروڑ افراد کٹ کر بھارت کی غیر مسلم ریاست میں جا چکے ہیں، اور اسکے صرف چھ کروڑ افراد بچ نکلے ہیں جن سے ہماری یہ مسلم ریاست وجود میں آئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم مزید تجزیہ و تقسیم برداشت کر سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم پھر تین تین کروڑ کے دو الگ حصوں میں بٹ جائیں اور پھر بھی اپنی قومی ہستی کو برقرار رکھ سکیں؟

تعداد کے لحاظ سے ہم چھ کروڑ بھی بھارت کے مقابلہ میں کمزور ہیں۔ جغرافی حیثیت سے ہمارا ابھی فاصلہ پہلے

ہی کمزوری کا ایک اہم سبب ہے، جس کی وجہ سے کسی خطرے کے وقت ہمارے لئے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچنا مشکل ہے۔ معاشی حیثیت سے ہماری طاقت جیسی کچھ بھی ہے، مشرقی پاکستان کے جُوٹ اور مغربی پاکستان کے غلّے اور کپاس سے مل کر بنتی ہے، ورنہ ہم میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ بجائے خود اپنے بل بوتے پر کھڑا ہو سکے۔ دفاع کے نقطۂ نظر سے ہمارے دونوں بازو مل کر تو پھر بھی ایک قابلِ لحاظ طاقت بنتے ہیں، ورنہ الگ الگ کوئی ایک بازو بھی اتنا طاقت ور نہیں ہے جو اپنے آپ کو بچا سکے۔

اس صورتِ حال میں کیا ایک مجنون اور احمق کے سوا کوئی شخص وہ راستہ اختیار کر سکتا ہے جو پاکستان کے دونوں حصّوں کو علیحدگی کی طرف لے جاتا ہو؟ عقل کی رو سے تو ہماری زندگی و بقا کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ایک قوم اور ایک مملکت بن کر رہیں۔

اب اگر اپنی قوم اور مملکت کی وحدت کا سوال ہمارے لئے درحقیقت زندگی اور موت کا سوال ہے تو یہ بات مشرقی اور مغربی پاکستان کے ہر مسلمان کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ہم کسی دوسرے مسئلے کو اس مسئلے سے زیادہ، یا اس کے برابر اہمیت نہیں دے سکتے۔ یہاں کوئی ایسا نادان دوست، یا دانا دشمن برداشت نہیں کیا جانا چاہیے، اور نہیں کیا جا سکتا، جو اپنی حماقتوں سے، یا اپنی چالوں سے ہماری وحدت کو خطرے میں ڈالے۔ ہر وہ شخص جو یہاں بنگالی، پنجابی، سرحدی، اور سندھی کے درمیان تفریق کرتا ہے، اور ان تعصبات کو اپنی زبان یا عمل سے ابھارتا ہے، وہ دراصل پاکستان کی جڑ کاٹتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ شخص پاکستان کے ساتھ دشمنی کر رہا ہے جو یہاں مقامی اور مہاجر آبادی کے درمیان فرق و اختلاف پیدا کرتا ہے، یا خود مہاجرین میں یوپی اور بہاری اور دہلوی وغیرہ کی عصبیتیں بھڑکاتا ہے۔ اسی طرح ایسے تمام لوگ بھی اپنی قوم اور ملک کے ساتھ بُرائی کر رہے ہیں جو مغربی پاکستان میں بیٹھ کر یہ سوچتے ہیں کہ مشرقی پاکستان ہمارے لئے ایک بوجھ اور ایک ذمہ داری کا پشتارہ ہے، یا مشرقی پاکستان میں بیٹھ کر یہ سوچتے ہیں کہ ہم چونکہ کثیر التعداد ہیں اس لئے محض ووٹوں کے بل پر ہم اپنی ہر بات منوالیں گے خواہ مغربی پاکستان والے اس پر راضی ہوں یا نہ ہوں۔ یہ تمام باتیں نہ صرف جاہلیت کی باتیں ہیں جو مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں، بلکہ یہ سخت خطرناک بھی ہیں، کیونکہ ان سے ہماری اس وحدت کو نقصان

پہنچتا ہے جس پر ہماری قومی زندگی کا انحصار ہے۔ جو قوم کٹ پھٹ کر پہلے ہی ۳/۵ رہ گئی ہو، اور وہ ۳/۵ بھی آدھوں آدھ کے حساب سے سینکڑوں میل کے فاصلہ پر بٹ گئے ہوں، اور اس کے دونوں حصوں کے درمیان ایک طاقت ور ہمسایہ معاندانہ جذبات لیے ہوئے حائل ہو، وہ اگر اس طرح کی احمقانہ باتیں سوچتی ہے تو دراصل اپنی شامت کو دعوت دیتی ہے۔

اس کے بعد یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ اصل چیز کیا ہے جس نے ہم سب کو ملا کر ایک قوم بنایا ہے؟

ظاہر ہے کہ وہ نسل نہیں ہے، کیونکہ نسل کے اعتبار سے ہم ایک نہیں بلکہ ان گنت نسلیں ہیں، اور اگر نسل ہی ایک قابلِ لحاظ چیز ہو تو ہم میں سے اکثر ایک دوسرے کی بہ نسبت اپنے ان غیر مسلم ہمسایوں سے قریب تر ہیں جو ابھی کل ہمارے خون کے پیاسے اور ہماری آبرو کے دشمن ثابت ہو چکے ہیں۔

ظاہر ہے کہ وہ زبان بھی نہیں ہے، کیونکہ زبان کے اعتبار سے بنگالی کا پنجابی سے، اور پنجابی کا سندھی اور پختون سے، اور پختون کا بروہی سے کوئی رابطہ نہیں۔ یہ رشتہ اگر برادری کی بنیاد بنتا تو مغربی پنجاب کو سندھ و سرحد سے جوڑنے کے بجائے مشرقی پنجاب سے جوڑتا، اور مشرقی بنگال کو ہزار میل دور کے مغربی پاکستان سے ملانے کے بجائے مغربی بنگال سے ملاتا۔

پھر کیا وہ معاشی مفاد ہے؟ یہ چیز اگر قومی وحدت کی بنیاد ہوتی تو مغربی پنجاب اُس ملک کے ساتھ جاتا جس میں اُس کی خوشحالی کے سارے سرچشمے واقع ہیں، بلکہ سرے سے پاکستان بنتا ہی نہیں، کیوں کہ سابق ہندوستان کے مختلف علاقے ایسے قریبی معاشی تعلقات رکھتے تھے جو تقسیم کے نہیں بلکہ وحدت کے متقاضی تھے۔

لامحالہ یہ ماننا ہی پڑے گا کہ وہ اسلام اور صرف اسلام ہے جس نے مشرق و مغرب کے مختلف عناصر کو جوڑ کر ایک قوم بنایا ہے، اور بس یہی ایک چیز ہماری قومی وحدت کی بنیاد ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس سے انکار کی جرأت صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو دو اور دو پانچ کہنے میں بھی تامّل نہ کرتا ہو۔

یہ اسلام کی وہ خاص اہمیت ہے جو دنیا بھر کی مسلمان قوموں میں سے صرف پاکستان میں اس کو حاصل

ہے۔ دوسری مسلمان قوموں کے لئے تو یہ دین ایک صداقت اور ایک راہِ نجات و فلاح ہونے کی حیثیت ہی رکھتا ہے، ان کا قومی وجود اس پر منحصر نہیں ہے۔ مگر ہمارے لئے وہ صرف اسی ایک حیثیت سے اہم نہیں ہے بلکہ یہاں خود ہماری زندگی و موت کا مسئلہ اس کے دامن سے وابستہ ہے۔ جتنا اس کے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط ہوگا اتنا ہی ہمارا قومی وجود مستحکم ہوگا، اور جس قدر یہ تعلق کمزور ہوگا اسی قدر ہمارے قومی وجود میں اضمحلال رونما ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ جس دن خدانخواستہ ہمارے لئے اسلام کی بہ نسبت زبان، نسل، یا معاش کے مسائل نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی وہی دن ہمارے حق میں قانونِ فطرت کے تحت سزائے موت کے فیصلے کا دن ہوگا۔ کیونکہ اس کے بعد کوئی چیز ہمارے مختلف اجزاء کو پارہ پارہ ہونے اور ہمیں بھیڑیوں اور کتوں کا شکار بننے سے نہ بچا سکے گی۔

اب ذرا اس سوال پر غور کیجیے کہ اسلام سے کسی ملک کے باشندوں کا تعلق مضبوط ہونے کے معنی کیا ہیں اور اس کی صورت کیا ہے؟

بظاہر لوگ اسلام کے ساتھ اس جذباتی تعلق کو بڑا ہی ایک مضبوط تعلق سمجھتے ہیں اور اسی کو کافی سمجھتے ہیں جو ہمارے عام باشندوں کو اس کے ساتھ صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ ہمارے باپ دادا کا دین ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسلام زندہ باد کے نعرے، اور یہ اسلام کے نام پر عوام کا اپنی جانیں فدا کرنا، اور یہ بات کہ ہمارا کوئی فاسق سے فاسق آدمی بھی قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہوتے دیکھنا برداشت نہیں کر سکتا، بس یہ اسلام کے ساتھ ہمارے قلبی تعلق کی گہرائی اور مضبوطی کا کافی ثبوت ہے، اور جب تک یہ موجود ہے ہمیں کسی فکر کی حاجت نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام محض ایک جذبے کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک علم، ایک طرزِ خیال، اور ایک نظامِ زندگی ہے۔ جب تک کوئی شخص اس کو جانے اور سمجھے نہیں، اور اس کی حقانیت پر عقلاً مطمئن نہ ہو، اس کے ساتھ محض دینِ آبائی ہونے کی وجہ سے جذباتی وابستگی، ایک سخت کمزور اور ناپائدار وابستگی ہوتی ہے جسے ہر گمراہی کی ہوشیارانہ تبلیغ متزلزل کر سکتی ہے، بلکہ بالکل فنا کر سکتی ہے۔ اسلام کے ساتھ جیسی کچھ جذباتی وابستگی ہمارے عوام میں پائی جاتی ہے، اس سے بدرجہا زیادہ گہری اور شدید وابستگی آج سے ۲۰ سال پہلے

بخارا اور سمرقند اور خوارزم میں موجود تھی۔ لیکن کمیونزم کے ہوشیار مبلغوں نے چند سال کے اندر اس کو ایسا فنا کر دیا کہ آج اسی سرزمین میں بڑی بڑی مسجدیں اور خانقاہیں تھیٹروں اور کلبوں اور عجائب خانوں میں تبدیل ہو چکی ہیں، اور امام بخاری کے وطن سے وہ شاعر اٹھ رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

"تم نے کہا تھا قرآن کے الفاظ لازوال ہیں ـــ تم کہتے تھے یہ مسجدیں کبھی خالی نہ ہوں گی، اسلام ہمیشہ قائم رہے گا ـــ ملا، اُستاد، کہاں گئیں تمہاری وہ پیشنگوئیاں؟ ـــ ملا، استاد، تمہارا خیال کر کے میں دل برداشتہ ہو جاتا ہوں!"

اور کہتے ہیں:

"اب یہاں امیروں اور بیگوں اور ملاؤں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے ـــ ہمیں اب نہ خدا کی ضرورت ہے اور نہ اس کے پیغمبر کی، خواہ وہ یہاں پیدا ہوں یا کہیں باہر سے آئیں۔"

اور کہتے ہیں:

"لینن کا ثانی دھرتی کی گود میں آج تک پیدا نہ ہوا، نہ اس کے دل کی کوئی نظیر ہے نہ دماغ کی۔"

یہ ہوتا ہے اُس جذباتی وابستگی کا حشر جو علم اور فہم اور عملی نفاذ کے بغیر ہو۔

اِس لئے ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے کہ اپنے دین کے بقا اور اپنی قومی مملکت کے استحکام کے معاملے میں صرف اُس جاہلانہ تعلق پر اعتماد کر لیں جو ہمارے عوام کے اندر اسلام کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ یہ تعلق، انگریزی تعلیم کی ہوا لگتے ہی جس طرح کافور ہو جاتا ہے اس کو ہم خود اپنے ملک میں، اپنے بھائی بندوں کی زندگیوں میں، اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر اسی عاشق دین قوم ہی کے گھر سے تو وہ لوگ اٹھ رہے ہیں جو علانیہ احکام خداوندی کی خلاف ورزی نہ صرف خود کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو اس خلاف ورزی کی تلقین بھی کرتے ہیں، شریعت کا مذاق اڑاتے ہیں، اور خدا اور آخرت اور رسالت میں شک، بلکہ انکار تک کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتے۔

اسلام کے ساتھ عوام کا تعلق اگر قابل اعتماد اور قابل اطمینان ہوسکتا ہے تو صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ اس کی مضبوطی کا انحصار صرف جذبات پر نہ ہو، بلکہ ہماری عام آبادی اسلام سے واقف ہو جائے، اسلام اور کفر کے بنیادی فرق و امتیاز کو سمجھ لے، اور گمراہ کن تحریکوں سے اپنے آپ کو بچانے کے قابل ہو جائے۔

یہ کام ہمیں جلدی سے جلدی اور بڑے سے بڑے پیمانے پر کرنا ہے، کیونکہ ہمارے دین اور ہماری مملکت کی جڑیں کھودنے والے اپنے کام سے غافل نہیں ہیں اور ہماری طرف سے غفلت کا ہر لمحہ ان کے لئے غارت گری کا ایک قیمتی موقع ہے۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب زبان کے مسئلے پر غور کیجیے۔ ہمارے لئے اس مسئلے کا یہ پہلو زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ کونسی زبان مملکت کی زبان بننے کے لئے زیادہ موزوں ہے، بلکہ ہم سب سے بڑھ کر اہمیت اس پہلو کو دیتے ہیں کہ ہم کس زبان کے ذریعہ سے اپنی عام آبادی میں اسلام کا علم جلدی سے جلدی، زیادہ سے زیادہ بڑے پیمانے پر، اور زیادہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ پھیلا سکتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو پنجابی، بنگالی، پشتو، سندھی، بلوچی، براہوی، سب علاقائی زبانیں غیر موزوں ہیں، اور صرف ایک اُردو زبان ہی ہے جس پر نگاہ انتخاب پڑ سکتی ہے۔ پچھلی ڈیڑھ دو صدیوں میں برعظیم ہند و پاکستان کے بہترین دماغوں نے اسلام پر جتنا کام بھی کیا ہے، ان علاقائی زبانوں میں نہیں بلکہ اردو میں کیا ہے۔ عربی زبان کے بعد آج دنیا میں کوئی زبان اسلامی لٹریچر کے لحاظ سے اتنی مالدار نہیں ہے جتنی اردو ہے۔ قرآن، حدیث، فقہ، کلام اور تاریخ اسلام پر جتنا ذخیرہ اس زبان میں موجود ہے، اس کا ہزارواں حصہ بھی علاقائی زبانوں میں نہیں ہے۔ آج ملک کے اہل دماغ دین کے حقائق کو عوام کے ذہن نشین کرنے کے لئے اور اصولِ دین کو مسائل حیات پر منطبق کرنے کے لئے جتنا کام کر رہے ہیں وہ بھی علاقائی زبانوں میں نہیں بلکہ اردو میں کر رہے ہیں۔

اس ساری دولت سے فائدہ اٹھانے کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں:۔

ایک یہ کہ ہم اس پورے ذخیرے کو بنگالی، پنجابی، اور دوسری علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے اور پھر انہیں شائع کرنے کا الگ الگ انتظام کریں، اور آئندہ بھی جو کچھ اردو میں شائع ہوتا رہے اس کے ترجمہ و اشاعت کا انتظام ان سب زبانوں میں کیا جاتا رہے۔

دوسرے یہ کہ ہم اردو زبان کی تعلیم کو سارے ملک میں عام کر دیں تاکہ تمام علاقوں کے لوگ اس دولت

سے یکساں مستفید ہوں اور آئندہ ہوتے رہیں۔

ہر وہ شخص جو اسلام کے مقابلے میں کسی دوسرے تعصب کو عزیز تر نہ رکھتا ہو، بلا تامل کہہ دے گا کہ ان دونوں صورتوں میں سے دوسری صورت زیادہ آسان اور زیادہ مفید ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کے لوگوں نے جن کو اپنی مادری زبانیں ہمارے بنگالی بھائیوں سے کچھ کم عزیز نہیں ہیں، اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے پسند کیا ہے۔ کیا ایسی کوئی معقول وجہ ہے کہ اس معاملے میں ہمارے بنگالی بھائی ہی سب سے الگ ایک راہ اختیار کریں؟ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ کیا وہ اسے پسند کرتے ہیں کہ بنگال کے عوام اسلام سے جاہل رہیں؟ یا وہ اس کے لئے تیار ہیں کہ دینی علوم کے اس پورے ذخیرے کو جو اردو میں ہے بنگالی میں منتقل اور شائع کرنے کا انتظام کریں؟ یا ان کے ہاں ایسے اہلِ قلم موجود ہیں جو خود بنگالی میں اعلیٰ درجے کا اسلامی لٹریچر تیار کر کے بنگالیوں کو اردو سے بے نیاز کر سکتے ہوں؟

بظاہر یہ ایک بڑی معقول تجویز نظر آتی ہے کہ بنگالی کو بھی اردو کے ساتھ ساتھ مملکت کی زبان بنا دیا جائے مگر اس پر ہم صرف دو سوال کرنا چاہتے ہیں:-

(۱) یہ مطالبہ صرف بنگالی ہی کے معاملہ میں کیوں صحیح ہو؟ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور برہوی بولنے والے بھی کیوں نہ یہی مطالبہ کریں؟

(۲) بنگالی بھائیوں کے اس مطالبے کو مان لینے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اہلِ بنگال صرف بنگالی زبان ہی پر قناعت کر لیں گے، اور اردو سیکھنے اور پھیلانے کی کوئی کوشش نہ کریں گے؟ کیا یہ چیز بنگال کے مسلم عوام کو اسلام سے جاہل رکھنے، مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے دور کرنے، اور مغربی بنگال کے ہندوؤں سے قریب تر کرنے کی موجب نہ ہوگی؟

ان سوالات کا کوئی معقول جواب وہ لوگ دے سکتے ہیں جنہوں نے یہ تجویز پیش کی ہے؟